نورالحسن راشد کاندھلوی*

سر سید احمد کے ایک بڑے استاد اور مربی
حضرت مولانا نورالحسن کاندھلوی
سر سید احمد کی تصانیف و مؤلفات میں مولانا کا تذکرہ
اور مولانا کے نام سر سید احمد کے خطوط

سر سید احمد ہماری ملّی علمی تاریخ کے ان ممتاز لوگوں میں سے ہیں جن کا تذکرہ ہماری تاریخ کا ایک اہم عنوان ہے اور جن کی خدمات و کارنامے بعد کی نسلوں کے لیے رہنما اور نشان راہ کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن بہت سے بڑے زعما صاحب نظر قائدین اور مفکرین کی طرح سر سید احمد کے بھی ابتدائی حالات کا مفصل تذکرہ نہیں ملتا، جو کچھ معلومات ہیں وہ عموماً الطاف حسین حالؔی کی اطلاعات (حیات جاوید) کے مندرجات کا تکرار ہیں۔

سر سید احمد پر لکھنے والوں نے ان کے ابتدائی حالات کا اس حیثیت سے بہت کم جائزہ لیا ہے کہ وہ کون کون سی شخصیات اور علماء تھے جن کے فیض صحبت سے سر سید احمد میں انسانیت کا جوہر پیدا ہوا، اور خدمت و تعلیم کی جوت جاگی۔ اور کون سے اساتذہ تھے جن کی تربیت اور تعلیم کے اثرات سر سید احمد کی زندگی پر سب سے زیادہ محسوس کیے گئے۔ آئندہ صفحات میں اسی کا کچھ تذکرہ ہے کہ سر سید احمد کے سب سے بڑے استاد، مربی، معلم اور محسن کون تھے، ان کے فیض صحبت سے سر سید احمد نے کیا، کیا پایا اور سر سید احمد نے مولانا سے اپنے پڑھنے اور خود پر مولانا کے احسانات کا کہاں کہاں کس طرح تذکرہ کیا، مولانا حالی نے خصوصاً نیز سر سید احمد کے اور تذکرہ نگاروں نے بھی مولانا کے تلمذ اور مولانا سے سر سید احمد کی نیاز مندی کے احوال کو، سر سید احمد کی متعدد صراحتوں، تصانیف، ترجموں، مکتوبات وغیرہ میں بار بار واضح اعتراف کی اطلاعات کو اس بے نیازی اور تجاہل عارفانہ کے ساتھ نظر انداز کیا ہے کہ اس علمی خیانت پر حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی۔

مولانا نورالحسن اپنے عہد کے ایک مشہور و ممتاز عالم، مدرس اور صاحب فضل و کمال شخص تھے، اپنے والد، دادا نیز مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی صدرالدین آزردہ، اور اس وقت کے ایک عالی مرتبت محدث

---

*مفتی الٰہی بخش اکیڈمی مولویان، کاندھلہ، ضلع مظفر نگر، یوپی، انڈیا، ۲۴۷۷۷۵

دادا حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق سے تعلیم حاصل کی، دہلی کے اکثر اہل علم وذوق سے جس میں غالب اور صہبائی بھی شامل ہیں، قریبی روابط اور خط وکتابت تھی۔

مولانا نورالحسن خلف مولانا ابوالحسن[1] بن مولانا مفتی الٰہی[2] بخش صدیقی کاندھلوی ۲۶ ربیع الثانی ۱۲۲۷ھ (۹ مئی ۱۸۲۰ء) کو پیدا ہوئے۔ عربی فارسی کی ابتدائی کتابیں اپنے والد اور دادا سے پڑھیں۔

تعلیم[3]: متوسط سے اعلیٰ تعلیم دہلی میں مکمل ہوئی، ۱۲۴۵ھ (۱۸۳۹ء) میں دہلی کالج میں نورالانوار وغیرہ پڑھتے تھے، اس کے بعد تعلیم کی مفصل روداد دستیاب نہیں مگر معتبر ذرائع سے معلوم ہے کہ مولانا کے دہلی کالج کے علاوہ مولانا مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا فضل حق خیرآبادی کے حلقۂ درس میں حاضر رہے، دونوں سے کئی سال تک فائدہ اٹھایا۔ حضرت شاہ محمد اسحاق کے مدرسہ میں قیام رہتا تھا، آخر میں شاہ محمد اسحاق صاحب سے حدیث شریف پڑھی[4]۔ دہلی میں تعلیم کا سلسلہ ۱۲۴۷ھ (۱۸۴۱ء) میں مکمل ہوگیا تھا، دہلی سے مولانا فضل حق خیرآبادی سے اعلیٰ ترین کتابیں پڑھنے کے لیے نکوڑ (ضلع سہارنپور، یوپی) پہنچے، مولانا فضل حق نکوڑ میں تحصیل دار تھے۔ اس قیام میں مولانا خیرآبادی سے فلسفہ اور عقلیات کی فاضلانہ کتابیں شرح تجرید وغیرہ پڑھیں[5]، (۵۶-۱۲۵۵ھ) میں شاہ محمد اسحاق کی خدمت میں حاضر رہ کر حدیث کی اعلیٰ ترین کتابیں صحیح بخاری اور صحیح مسلم دوبارہ پڑھیں۔

دورِ ملازمت: مولانا نورالحسن دہلی میں تعلیم سے فارغ ہوئے تھے کہ ٹامس مٹکاف نے مولانا کی عمدہ لیاقت وصلاحیت کی وجہ سے (شمالی ہندوستان کے ممتاز علمی ادارہ) آگرہ کالج میں استاذ، اور شعبۂ عربی کے صدر کے لیے سفارش کی[6]، مولانا کی اعلیٰ صلاحیت کی وجہ سے سفارش منظور ہوئی اور مولانا آگرہ کالج میں عربی شعبہ کے صدر اور پروفیسر نامزد کردیئے گئے۔ سرسید احمد کے الفاظ میں:

> ''مولوی نورالحسن مرحوم چند سال تک آگرہ کالج میں اس وقت
> پروفیسر عربی تھے جب کہ اس زمانہ میں ایسے کالجوں کی عربی کی
> اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی جاتی تھی[7]''۔

مولانا تقریباً چار سال تک اس عہدہ پر فائز رہے، چار سال کے بعد سکریٹری کالج کے متعصبانہ رویہ کی وجہ سے اس وقیع ملازمت کو ترک کرکے واپس آگئے۔

۱۲۶۲ھ (۴ جنوری ۱۸۴۶ء) میں نکوڑ میں قائم مقام تحصیل دار کی ملازمت پر تقرر ہوا، ایک سال کے بعد (۱۸۴۷ء میں) تحصیل دار کے عہدہ پر ترقی ہوئی، اپریل ۱۸۵۱ء (جمادی الآخری ۱۲۶۷ھ) میں اس ملازمت کو بھی چھوڑا، چند مہینے وطن میں گذار کر بنے سنگھ مہاراجہ الور کی طلب پر الور چلے گئے۔ تمبر ۱۸۵۱ء (ذی قعدہ ۱۲۶۷ھ) میں الور پہنچے، تقریباً دس سال عزت واحترام کے ساتھ الور میں گزارے، اسی دوران مولانا کی کوشش سے مولانا فضل حق خیرآبادی بھی الور آگئے تھے، مولانا نورالحسن

جمادی الآخر ۱۲۷۶ھ (جنوری ۱۸۶۱ء) کے آخر تک الور میں رہے [۸] اس کے بعد جلد ہی ملازمت سے مستعفی ہو کر وطن آ گئے تھے اس وقت سے آخر تک تقریباً نو سال وطن میں درس و افادہ میں مشغول رہے، کاندھلہ میں ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) میں وفات پائی۔

مولانا کے اساتذہ اور اس دور کے بڑے علماء میں مولانا کا مرتبہ: مولانا نور الحسن زمانہ طالب علمی سے شرافت و اخلاق، ذہانت و ذکاوت اور اعلیٰ علمی صلاحیتوں کی وجہ سے اپنے استاذوں کی نگاہوں میں عزیز تھے۔ تعلیم کے بعد مولانا نے جس رفتار سے علمی پرواز کی اس سے مولانا کا مرتبہ بہت بڑھ گیا تھا، مولانا کے استادوں میں سے مولانا آزردہ اور خیر آبادی دہلی کے علمی حلقوں کے گوہر شب تاب، اور اپنے اپنے مقام پر منفرد حیثیت کے اصحاب تھے، دونوں کو مولانا نور الحسن سے گہرا قلبی ربط تھا اور ایسے مراسم تھے کہ ایسے بڑوں کے اپنے چھوٹوں اور شاگردوں سے کم ہوتے ہیں۔

مفتی صاحب اور خیر آبادی اپنی ہر ایک علمی دریافت میں مولانا کو شریک فرماتے تھے، کوئی اچھی کتاب ملتی تو مولانا کو اطلاع دی جاتی تھی، شعر و ادب کی سوغات ہاتھ آتی تو مولانا کو یاد کیا جاتا تھا، مولانا خیر آبادی اور مفتی صاحب اپنی منظومات سب سے پہلے مولانا کو بھیجتے، ان کی رائے کا انتظار کرتے، ان کی پسند ناپسند پر اعتماد فرماتے تھے، قصیدہ کہتے تو مولانا سے تبصرہ کی فرمائش کی جاتی، غزل کہتے تو ان کے اظہار خیال کا انتظار کرتے، عربی نظم ہو یا فارسی اردو غزل اور قصیدہ ہو یا کوئی علمی افادہ اور دریافت و پیش رفت، سب میں اساتذۂ کرام مولانا کو یاد فرماتے تھے۔ [۹]

جب ایسے صاحب نظر استادوں کے اعتماد و محبت کا یہ عالم ہو تو اور علماء جس قدر بھی لحاظ فرمائیں کم تھا۔ اس دور کے متعدد بڑے علماء سے مولانا کے رابطوں اور ان کے مولانا پر علمی اعتماد اور مولانا کے رائے جاننے کے اہتمام کا، مختلف مکتوبات و تحریرات میں تذکرہ ملتا ہے۔ شہرۂ آفاق عالم مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے جب عیسائیت کی تردید میں اپنی اہم کتاب ''ازالۃ الاوہام'' تصنیف کی تو اس کا مسودہ مولانا نور الحسن کے پاس بھیجا اور لکھا کہ اس علاقہ میں اور کوئی عالم ایسا نہیں ہے کہ جس سے اس اہم نازک موضوع پر رائے لی جا سکتی ہو، آپ ایسے واحد شخص ہیں اس لیے یہ مسودہ بھیج رہا ہوں، بہ مہربانی اطلاع دیجیے کہ یہ کسی لائق اور اشاعت کے قابل ہے یا نہیں؟ اگر یہ آنجناب کے خیال میں لائق اشاعت ہو تو خیر ورنہ میں اس کو ضائع کر دوں۔

اس دور کے ان مشاہیر و افاضل میں سے جو مولانا سے خاص روابط رکھتے تھے اور اپنی تصانیف و مؤلفات مولانا کو بھیجتے رہتے تھے، مولانا امام بخش صہبائی، مرزا غالب، مولانا شیخ محمد تھانوی، مولوی امداد العلی مراد آبادی بھی شامل تھے۔ [۱۰]

سرسید تو مولانا کے شاگرد ہی تھے اس لیے وہ اپنی ہر ایک تحریر و تصنیف مولانا کی خدمت میں

ارسال کرتے، حضرت مولانا کی رائے کا انتظار کرتے اور اس کتاب کی قدر و قیمت متعین کرنے میں مولانا کی رائے میں خاص طور پر اعتماد کرتے اور اس کو قول فیصل سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ مولانا اور مولانا کی وفات کے بعد ان کے فرزندان سے اپنے تمام اہم معاملات و مسائل میں مشورہ کرتے اور ان کی رائے کو وقعت دیتے تھے۔

سرسید احمد نے اپنی اہم اور ممتاز تصنیف تبیین الکلام (فی تفسیر التورات والانجیل علی ملۃ الاسلام) کا نسخہ مولانا کی خدمت میں بھیجتے وقت مولانا کو ایک مفصل اور تاریخی خط لکھا تھا، اس کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:

> ''دیباچہ اس تفسیر (تبیین الکلام) کا چھپ چکا ہے، صرف بعض باتیں متعلقہ تاریخ اس میں باقی ہیں، جس قدر دیباچہ چھپ چکا ہے وہ خریداروں کو تقسیم ہوا ہے اور اکثر اس زمانہ میں جو عام دین گنے جاتے ہیں ان کی نگاہ سے بھی گزرا ہے، اس پر میرا عجیب حال ہے، بعضے لوگ تو بہت تعریف کرتے ہیں اور کہتے کہ در حقیقت یہ کتاب ایک عمدہ پناہ مسلمانوں کے مذہب کو زمانہ حال کے ہاتھ سے ہے، اور بعضے لوگ برخلاف اس کے مجھ کو کافر اور مرتد اور بے دین، اور بعضے بزرگوار نصرانی بتاتے ہیں، اور دشنام دے کر میرے نام کو یاد کرتے ہیں''۔

اس کے بعد اس کتاب کی وجہ سے سرسید پر جو تبصرہ آرائی ہوئی اس کا بھی تذکرہ کیا ہے، پھر لکھا ہے:

> ''ان کو ملاحظہ کرنے کے بعد مجھ کو مطلع فرمایئے کہ میں کون ہوں، مسلمان یا کافر یا مرتد یا نصرانی''

درس اور شاگرد: جب مولانا دہلی میں پڑھ رہے تھے اسی وقت سے نیچے کے درجوں کے طالب علموں کو مختلف کتابیں پڑھانی شروع کر دی تھیں، تعلیم کے بعد جہاں بھی رہے درس کا معمول جاری رہا۔ ٹونک اور الور کی ملازمتوں میں بھی طلبہ کی جماعتیں موجود رہتی تھیں، مولانا ان کو تمام کتابیں توجہ سے پڑھاتے تھے، مولانا کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ ملازمت میں تیس طلبہ مولانا کے پاس رہتے تھے، تعلیم کے علاوہ ان سب کے کھانے پینے رہنے کے تمام اخراجات بھی اپنی جیب خاص سے ادا فرماتے تھے۔[۱۱]

الور سے وطن واپسی کے بعد تمام اوقات درس سے گھرے ہوئے رہتے تھے، ملک اور بیرون ملک سے ممتاز و فاضل طالب علم اعلیٰ درجہ کی منتہیانہ کتابیں پڑھنے اور مختلف علوم میں کمال حاصل کرنے کے لیے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ دقیق سے دقیق اور مشکل سے مشکل کتابوں کی تعلیم میں مولانا کو اعلیٰ درجہ کی مہارت تھی، قابل ترین جید طلبہ مولانا کی خدمت میں پڑھنے کے لیے آتے تھے، جن

میں کئی طلبہ ایسے ہوتے تھے جو ہندوستان بھر کا سفر کرنے اور بیسیوں علماء اور اساتذہ کا جائزہ لینے کے بعد بڑے علماء کے مشورے پر مولانا کی خدمت میں رہا کرتے اور بہت فائدہ اٹھاتے تھے۔[۱۲]

مولانا نورالحسن منطق و فلسفہ اور اکثر عقلی علوم و مباحث کے علاوہ حدیث و فقہ، عربی ادب، لغت اور اس کے مختلف مباحث پر وسیع گہری نظر رکھتے تھے اور اکثر علوم کا درس دیتے تھے، فارسی ادب اور تاریخ کے موضوعات سے بھی گہری واقفیت اور دلچسپی تھی، ان کے بھی اسباق ہوتے رہتے تھے۔

مولانا کی ایک اور بڑی دلچسپی اور مصروفیت اہم کتابوں کی تلاش و جستجو، نادر کتابوں کی تلاش اور ان کی نقل اور تازہ ترین مطبوعات کی خریداری تھی، جس میں مفتی آزردہ، مولانا خیرآبادی وغیرہ کے علاوہ غالب بھی مولانا کے معاون اور مشیر تھے۔

اگرچہ مولانا کی زندگی کا تیس سال سے زیادہ عرصہ درس و تعلیم میں گزرا، مولانا نے جیسا کہ گزرا زمانہ طالب علمی سے پڑھانا شروع کر دیا تھا، یہ معمول سرکاری وغیرہ سرکاری ملازمتوں کے باوجود زندگی کے آخری ایام تک جاری رہا، مگر اس وقت کے تقریباً سب ہی علماء اور بھلائی کے کام کرنے والے اصحاب کی طرح، مولانا بھی نیکی کر دریا میں ڈال، کے اصول پر بہت سختی سے کاربند رہتے تھے، اسی لیے نہ مولانا کے شاگردوں کی کوئی مفصل فہرست مرتب ہوئی، نہ رجسٹر۔ لیکن جو متفرق روایات و اطلاعات ملتی ہیں ان سے تصدیق ہوتی ہے کہ مولانا کا حلقۂ درس ایک بھرپور اور پورے ملک میں مشہور حلقۂ درس تھا جس میں دور دراز سے شائقین علم آتے تھے، اپنی علمی تشنگی دور کر کے اور دامن مراد پُر کر کے واپس جاتے تھے۔ مختلف تذکروں اور تحریرات سے حضرت مولانا کے چند شاگردوں کی صراحت ملی ہے جو یہ ہے:

۱۔ مولانا احمد حسن مرادآبادی (م ۱۲۸۸ھ)
۲۔ مولانا مفتی ریاض الدین خاں کاکوری (۱۲۹۵ھ)
۳۔ مولانا لطف علی راجگیری (۱۲۹۶ھ)
۴۔ مولانا عبداللہ بلگرامی (۱۳۵۰ھ)
۵۔ مولانا عبدالحق خیرآبادی (۱۳۱۸ھ)
۶۔ مولانا محمد بن غلام رسول سورتی (۱۳۲۴ھ)
۷۔ مولانا عبداللہ بایزید پوری (۱۳۲۸ھ)
۸۔ مولانا احمد حسین بٹالوی (۱۳۳۸ھ)
۹۔ مولانا سید محمد تقی نصیرآبادی
۱۰۔ مولوی عبدالرحمٰن کلیانوی (سپرنٹنڈنٹ پولیس و جج اودے پور)
۱۱۔ مولوی محمد ابراہیم انصاری کیرانوی۔[۱۳]

۱۲۔ سر سید احمد (۱۳۱۵ھ۔۱۸۹۸ء)

سر سید احمد کے مولانا اوران کے خاندان سے پرانے روابط: سر سید کی مولانا نورالحسن سے پہلی ملاقات کہاں اور کب ہوئی اس کا تذکرہ نہیں ملا، لیکن مولانا اوران کے خاندان سے سر سید احمد کے خاندان اور بزرگوں کے مراسم تھے، سر سید احمد کے الفاظ میں:

''اس خاندان اور میرے خاندان سے کئی نسلوں سے بہت زیادہ تعارف رہا ہے''

پرانی نسلوں کا حال معلوم نہیں، لیکن سر سید احمد کے نانا سید فریدالدین کے مولانا کے دادا مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء) سے واقفیت اور روابط کے اشارات ملتے ہیں، ان ہی روابط کا تسلسل تھا کہ سر سید احمد مولانا نورالحسن کے دامن تلمذ سے وابستہ ہوئے، سر سید نے مولانا سے کب اور کہاں پڑھا اس کی تفصیل بہت واضح نہیں، مگر قرین قیاس ہے کہ مولانا کے دہلی میں پہلے قیام کے زمانہ میں سر سید اور مولانا کے خاندانی تعلقات کی وجہ سے ملاقات اور تعلیم واستفادہ کی راہ کھلی ہوگی بعد میں اس میں توسیع اوراضافہ ہوا ہوگا۔

حالی کی روایات: ذکر آچکا ہے کہ مولانا نورالحسن تقریباً ۱۸۴۰ء میں آگرہ کالج میں شعبۂ عربی کے صدر اور پروفیسر مقرر ہوئے تھے، اس کے دو سال بعد سر سید احمد مولانا سے دہلی میں غالباً تعلیم حاصل کر چکے تھے، جنوری ۱۸۴۲ء میں فتح پور سیکری کے منصف مقرر ہوکر آئے۔[۱۴] فتح پور پہنچ کر سر سید احمد نے مولانا سے رشتۂ تعلیم کی تجدید کی، سر سید احمد ہر اتوار کو فتح پور سیکری سے مولانا کی خدمت میں آگرہ حاضر ہوتے اور تعلیم حاصل کرتے تھے۔

اگرچہ حالؔی نے اس کی پوری کوشش کی ہے کہ مولانا نورالحسن سے سر سید احمد کی شاگردی کی تمام روایات کو سر سید احمد کی تصدیقات ومندرجات کو اور اس سلسلہ میں موجود جملہ تحریرات اور شہادتوں کو بالکل نظرانداز کردیں، مگر سچائی ہزار پردوں سے نکل کر آجاتی ہے، حالؔی نہ چاہتے ہوئے بھی مولانا سے سر سید کی شاگردی اور سلسلہ تعلیم واستفادہ کا صاف اعتراف کر گئے ہیں۔ حالؔی نے لکھا ہے:

''جس زمانہ میں وہ (سر سید) فتح پور سیکری میں منصف تھے اس وقت مولانا نورالحسن مرحوم آگرہ میں منصف تھے، سر سید کی ان سے نہایت گہری دوستی تھی، مطالعہ کے وقت کتاب کے مشکل مقامات جو سمجھ میں نہ آتے تھے ان کے سمجھنے کے لیے ہر اتوار کو وہ گھوڑے پر سوار ہوکر فتح پور سے آگرہ مولانا کے پاس آتے تھے، کئی برس بلاناغہ ان کا یہی دستور رہا۔

''وہ (سر سید) کہتے تھے کہ میرا گھوڑا راستہ سے ایسا آشنا ہوگیا تھا

کہ ایک بار آگرہ سے چھوٹ کر فتح پور اپنے استھان پر پہنچ گیا''۔[۱۵]

مگر حالی کی اس اطلاع میں دو فروگذاشتیں ہیں، حالی نے مولانا کو آگرہ کا منصف لکھا ہے جو صحیح نہیں، مولانا آگرہ کالج میں عربی کے پروفیسر تھے اور حالی نے مولانا سے سرسید احمد کے استفادہ کا بھی اس طرح ذکر کیا ہے جیسے وہ ایک دفعہ الوقتی برائے نام سا مشغلہ تھا، جس کا کوئی خاص مقصد نہیں تھا حالانکہ یہ تاثر جو سرسید احمد کی تصریحات کے خلاف اور حالی کی واضح بددیانتی اور احوال سرسید احمد میں دانستہ غلط بیانی کی ایک بڑی شہادت ہے۔

سرسید احمد کی تصانیف میں مولانا نورالحسن سے تلمذ کا تذکرہ: سرسید احمد نے آگرہ کے قیام کے زمانہ میں تصنیف و تالیف کی ابتدا کی تھی اور ایسا لگتا ہے کہ اس سلسلہ کا آغاز مولانا نورالحسن کی فرمائش، مکمل تعاون اور اصلاح و سرپرستی کے اطمینان کے بعد ہوا۔ سرسید کی ملازمت فتح پور کے زمانہ کی پہلی یادگار جلاء القلوب بذکر المحبوب صلی اللہ علیہ وسلم ہے، اس کے بعد تحفۂ حسن مرتب ہوئی، اس کے نام میں مرتب و مترجم کی اپنے محترم استاد (مولانا نورالحسن) سے عقیدت و محبت صاف نظر آرہی ہے، سرسید احمد نے اس رسالہ کا یہ نام اپنے محترم استاد و مربی کے نام سے استفادہ کرتے ہوئے اور ان کے نام کی مناسبت سے رکھا ہے۔ تیسری تالیف ''تسہیل فی جرّثقیل'' ہے، اس میں بھی مرتب و مترجم کو حضرت مولانا کی مکمل سرپرستی اور بھرپور تعاون حاصل رہا ہے، تینوں کی تمہید و ابتداء میں سرسید احمد نے مولانا نورالحسن سے شاگردی کا اور ان کی عنایات سے اپنی تالیف و ترجموں کا ذکر و اعتراف کیا ہے، تینوں کے الفاظ سے سرسید کی حضرت مولانا سے نیازمندیٔ نسبت تلمذ کی مسرت اور استاد محترم سے محبت چھلکی پڑ رہی ہے۔ سرسید احمد کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''الف: جناب استاذی اعلم العلماء و افضل الفضلاء مولانا محمد نورالحسن
ب: جناب استاذی اور بمدذی، حضرت مولانا محمد نورالحسن
ج: اپنے استاد، مولوی محمد نورالحسن صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ''

جلاء القلوب بذکر المحبوب صلی اللہ علیہ وسلم: جلاء القلوب، مذہبی موضوعات پر سرسید احمد کی پہلی تالیف یا ترجمہ ہے، جو ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں مرتب و مکمل ہوئی۔ یہ حضرت شاہ ولی اللہ کی سیرت پر مشہور کتاب ''سرور المخزون'' کا اردو ترجمہ ہے۔ جلاء القلوب پہلی مرتبہ سرسید احمد کے بڑے بھائی سید محمد کے مطبع لیتھوگرافک پریس سے چھپی تھی۔[۱۶] سرسید احمد نے اس کی تمہید میں لکھا ہے:

''فقیر حقیر سید احمد حسینی الحسنی، المخاطب بہ جوادالدولہ سید احمد خاں
بہادر عارف جنگ نے اس رسالہ کو سرور المخزون سے ماخوذ کیا
اور چند مطالب مدارج النبوۃ سے اس میں بڑھائے، اور بعض

بعض باتیں اصل رسالہ سے کم کردی گئیں اور جناب استادی اعلم العلماء وافضل الفضلاء مولانا محمد نورالحسن سلمہ اللہ تعالیٰ کی اصلاح سے صحیح ودرست ہوا۔"[۱۷]

تحفۂ حسن: جلاء القلوب کے بعد سرسید احمد نے تحفۂ حسن مرتب کی، یہ مختصر تالیف حضرت شاہ عبدالعزیز کی مشہور کتاب تحفہ اثنا عشریہ کے دسویں باب ''مطاعن سیدنا ابوبکر صدیقؓ اوران کے جوابات' کا حضرت مولانا نورالحسن کے مشورہ سے، مولانا کی ہدایات اور رہنمائی میں کیا گیا ترجمہ ہے، مولانا نے اس کی مکمل نظر ثانی اور اصلاح فرمائی ہے۔ سرسید احمد نے استاد محترم کے احسانات اوران سے اپنی نسبت تلمذ کے ظاہر کرنے کے لیے اس کا نام ''تحفۂ حسن'' رکھا اوراس کی وجہ تالیف میں مولانا کی عنایات کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا:

''جناب مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ العزیز نے تحفہ اثنا عشریہ لکھا ہے، اس سے تحفہ کوئی کتاب نہیں ہوسکتی اور بن نہیں آتی، اس واسطے میں نے اس کتاب کے دسویں باب سے مطاعن حضرت ابوبکر صدیقؓ کا جوخلیفہ اول ہیں صاف اردوزبان میں ترجمہ کیا کہ چھوٹے سے بڑے تک اور جاہل سے عالم تک کو فائدہ پہنچے، اور شیعوں کی اوچھی اوچھی باتیں سب کومعلوم رہیں اوراس ترجمہ کا نام ''تحفۂ حسن'' رکھا۔

''اگر چہ ظاہر ہے کہ اس ہیچمدان کواتنی کہاں استعداد تھی کہ تحفہ کے ترجمہ کا نام لیتا، بلکہ اس کا خیال بھی دل میں لاتا، لیکن جناب استادی اور ملاذی حضرت مولانا نورالحسن کو اللہ تعالیٰ سلامت رکھے اوردین ودنیا میں ان کا بھلا کرے کہ انہوں نے میرے دل کوتقویت دی اور سب طرح کی ذمہ داری لی، جب میں نے اس پر ہاتھ ڈالا اور ترجمہ کاارادہ کیا۔''

''شکر خدا کہ یہ سارا ترجمہ ان کی اصلاح سے درست ہوا اوران کے ملاحظہ سے گزرا ہے، اب اللہ سے یہ امید ہے کہ سب کے پسند آوے اوراس کے سبب سے لوگوں کوہدایت ہووے اور مجھے اور مولانا کوثواب ملے۔ وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین۔ صلی الله علی خیر خلقه محمد و آله

و اصحابہ اجمعین۔''[۱۸]

تحفۂ حسن سرسید احمد اور حالی کی صراحت کے مطابق ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) میں تالیف و ترجمہ ہوا، اور اسی سال پہلی مرتبہ چھپا۔

تسہیل فی جرثقیل: سرسید احمد کی آگرہ میں قیام کے زمانہ کی تیسری یادگار تالیف جرثقیل کے موضوع پر ہے، یہ اسی موضوع کی ایک فارسی تالیف ''معیار العقول'' کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کا فارسی قلمی نسخہ سرسید احمد کے مطالعہ سے گزرا تھا، سرسید احمد نے اس کو پڑھا اور اس کے بعض قواعد کا جارج ہملٹن وغیرہ کے سامنے اعادہ و تذکرہ کیا، ان لوگوں نے اس رسالہ کے ترجمہ کی فرمائش کی، سرسید احمد نے اس کا اردو ترجمہ کیا اور:

''اپنے استاد مولوی محمد نور الحسن صاحب سلمہ اللہ کی اصلاح سے صحیح و درست کیا''۔[۱۹]

یہ ترجمہ اسی سال ۱۸۴۴ء (۱۲۶۰ھ) میں آگرہ اسکول بک سوسائٹی نے شائع کیا۔[۲۰]

سرسید احمد نے اپنی ان تینوں کتابوں میں مولانا نور الحسن سے شاگردی اور اپنی ممنونیت کا بے تکلف و عاجزانہ تذکرہ کیا ہے، یہاں پہلی دونوں تالیفات کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ ان میں پہلی دونوں تالیفات جلاء القلوب اور تحفۂ حسن کو سرسید احمد نے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں اپنی تصانیف و تالیفات کے مجموعہ ''تصانیف احمدیہ'' کی پہلی جلد میں شامل و شائع کیا تھا، اس اشاعت میں سرسید احمد نے اپنی ان کتابوں کے مباحث و مضامین پر اپنے متاخر خیالات کی روشنی میں تنقید و تبصرہ کیا ہے اور ان مباحث میں سرسید احمد کے نظریات میں جو تبدیلی آگئی تھی اس کا مفصل تذکرہ کیا ہے، مگر مولانا نور الحسن کے لیے اعتراف تلمذ مندی کے جو الفاظ پہلی اشاعت میں درج تھے، ان میں ایک حرف کی بھی ترمیم نہیں کی، تصانیف احمدیہ میں شامل نسخۂ تحفۂ حسن کے آغاز پر جہاں مولانا نور الحسن کا ذکر ہے، اس کے حاشیہ میں سرسید احمد نے صرف یہ الفاظ بڑھائے ہیں:

''جناب مولانا وحبینا حاجی حافظ محمد نور الحسن صاحب کاندھلوی نے ۱۱ رمحرم ۱۲۸۷ھ کو انتقال فرمایا، انا للہ وانا الیہ راجعون''۔[۲۱]

آثار الصنادید: آگرہ سے دہلی واپسی کے بعد سرسید احمد نے اس وقت تک کی، اپنی سب سے اہم کتاب آثار الصنادید پہلی مرتبہ سرسید احمد کے بھائی، سید عبد الغفور کے مطبع سید الاخبار سے ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں شائع ہوئی تھی۔ آثار الصنادید چار ابواب پر مشتمل ہے، آخری چوتھا باب ''دہلی اور دہلی کے لوگوں کے بیان میں'' ہے، سرسید احمد نے لکھا ہے کہ یہ باب ان لوگوں کے لیے مختص ہے جو ضابطہ میں

دلی والے تھے، ضمناً ایسے بھی چند علماء اور اہل کمال کا تعارف شامل ہے، جو ملازمت یا درس و افادہ کے لیے برسوں دہلی میں رہے، مگر اس میں مولانا نورالحسن صاحب کا تذکرہ بھی شامل ہے، یہاں بات توجہ چاہتی ہے کہ اس میں مولانا نورالحسن کا نام کیوں شامل ہے، حالانکہ مولانا طالب علمی کے علاوہ کبھی دہلی میں نہیں رہے، خصوصاً آثار الصنادید کی تالیف کے وقت مولانا کے دہلی میں قیام کی کوئی اطلاع نہیں، یہ سر سید احمد کی مولانا سے نیازمندی اور عقیدت و محبت تھی کہ انہوں نے اس بزم نگاراں میں حضرت مولانا کو شامل کیا اور مولانا کے نہایت طاقتور، موثر اور نیازمندانہ تذکرہ کے لیے دو صفحے وقف کیے، اور مولانا کو محبت وعقیدت کا بھرپور نذرانہ پیش کیا۔

آثار الصنادید میں ''ذکر علمائے دین رضی اللہ عنہم اجمعین'' میں مولانا فضل حق خیر آبادی کے تذکرہ کے فوراً بعد مولانا نورالحسن کا ذکر ہے، جو آثار الصنادید کی سب سے پہلی اشاعت کے دو صفحات پر مشتمل ہے، اس کے اختتام پر سر سید احمد نے مولانا نورالحسن کے لیے ایسے نیازمندانہ اور پُرزور الفاظ لکھے ہیں، جو آثار الصنادید میں کسی اور عالم کے لیے درج نہیں کیے، سر سید احمد نے لکھا ہے:

''بہ مقتضائے اس کے کہ بداں را بہ نیکاں بخشد کریم راقم آثم کے حال پر ان حضرت کی نگاہ توجہ کو ایسا مصروف کر دیا کہ بدرجہ عنایت نظر، تربیت استادانہ سے منظور فرماتے ہیں تاکہ شاید یہی نظر بارگاہ کریم میں اس احقر کی نجات کا سبب ہو جاوے۔ کوتاہ شب و فسانہ بسیار، زبان قاصر ہے کہاں تک کہے، اگر زمانہ مساعد ہوگا تو ایک دفتر علیحدہ ان سرگردہ کملائے دہر کے محامد میں لکھوں گا''۔[۲۲]

آثار الصنادید کے چوتھے باب میں ایک سو سترہ علماء اور اہل کمال کا تذکرہ ہے جس میں سر سید احمد کے خاندان سے تعلق رکھنے والے اور ہندوستان کے بزرگ ترین علماء اور اہل علم شامل ہیں، مگر ان میں سے کسی کا بھی مفصل علیحدہ تذکرہ لکھنے کی تمنا کا ذکر نہیں، اور یہ بات سر سید احمد اس وقت لکھ رہے تھے جب وہ دہلی کی علمی تہذیبی دنیا میں ایک قابل ذکر مقام پر پہنچ گئے تھے، ایک اچھے سرکاری عہدہ پر فائز تھے، اگر وہ اس وقت مولانا کا تعارف شامل کرنے کا ایسا اہتمام نہ کرتے اور مولانا سے اپنے تلمذ اور دلی عقیدت کو ظاہر نہ کرتے تو اس کی گنجائش تھی، لیکن سر سید احمد کی شرافت اور اس محبت نے جو سر سید کے دل میں جاگزیں تھی اس حقیقت کو چھپانا اور اس میں ذرا بھی کوتاہی برتنا مناسب نہ سمجھا، اور صاف لکھ دیا کہ مولانا مجھے تربیتِ استادانہ سے ممنون و مشرف فرماتے ہیں، ممکن ہے کہ اس نظر عنایت کی بدولت آخرت میں میری بخشش ہو جائے کہ:

''بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم''

سرسید احمد کی مولانا سے طویل اور مسلسل خط وکتابت: سرسید احمد کے مولانا سے یہ روابط پوری زندگی قائم رہے، سرسید احمد نے مولانا سے ہمیشہ اسی طرح نیاز مندی کا تعلق رکھا، سرسید احمد اپنے تمام معاملات مولانا کے سامنے پیش کرتے، مولانا کا مشورہ چاہتے، اپنی تصانیف وکتب مولانا کی خدمت میں بھیجتے، مولانا سے ہدایت ورہنمائی کے طالب رہتے تھے۔ مولانا کو خطوط لکھتے تو اس طرح جیسے ادنیٰ خادم اور شاگرد لکھ رہا ہو، ویسے ہی الفاظ، وہی عاجزی ونیازمندی۔ مولانا کے نام سرسید احمد کے جو خطوط اس وقت تک موجود ہیں ان کا سرنامہ اور اختتامی الفاظ اس کی واضح مثال ہیں، ایک خط کا ان الفاظ سے آغاز ہوا ہے:

''جناب حضرت قبلہ کونین وکعبۂ دارین مدظلہ''

اسی خط میں لکھا ہے:

''بہر حال خادم وکم ترین غلام شما ام، اگر ذرہ نوازی و پروردہ پروری خواہد ساخت، بعید از عنایت بزرگانہ نہ خواہد بود''

ترجمہ: بہر حال میں آنجناب کا خادم اور کمترین غلام ہوں، اگر ذرہ نوازی اور اپنے پالے ہوؤں کی مزید سرپرستی ہو تو یہ بزرگوں کی اپنے چھوٹوں پر عنایت سے غیر متوقع نہیں''۔

(مکتوب محررہ ۱۸/اپریل ۱۸۴۹ء)

دوسرے خط کے ابتدائی کلمات بھی پڑھ لیجیے:

''جناب حضرت قبلہ وکعبہ دو جہانم سلامت، بعد ادائی آداب وتسلیمات غلامانہ''

اس مکتوب کا اختتام ان الفاظ پر ہوا ہے: عرضی کمترین غلامان سید احمد

ان دونوں ہی خطوط میں سرسید نے اپنے کو مولانا کے کمترین غلاموں میں شمار کرانے کا اہتمام کیا ہے، جو سرسید کی تحریرات میں ایک بے مثال نظیر ہے۔ سرسید کے کسی اور خط میں کسی کے لیے بھی ایسے الفاظ نہیں آئے، ان سے ہر ایک لفظ اس نسبت وارادت کا ترجمان ہے جو سرسید احمد کو مولانا کی ذات گرامی سے تھی، اور سرسید احمد کے یہ مراسم اور روابط مولانا نورالحسن کی حیات اور ان کی ذات تک محدود نہیں تھے، بلکہ اس نسبت سے جو ایک رشتہ قائم ہوا تھا سرسید احمد نے پوری زندگی اس کی تکمیل و پاسداری کی اور مولانا نورالحسن کی وفات کے بعد ان کے فرزندوں اور اقارب سے ویسا ہی معاملہ رکھا جو اس تعلق کا تقاضہ تھا۔

اسی تعلق کا اثر تھا کہ جب سرسید احمد نے ایم۔اے۔او کالج کا منصوبہ بنایا اور اس کے لیے اساتذہ اور مدرسین مقرر کیے گئے تو ان میں پہلا اور ممتاز ترین عہدہ مولانا نورالحسن کے فرزند مولانا محمد اکبر کے لیے منتخب کیا، مولانا اکبر شعبۂ عربی کے سربراہ اور سرسید کے دست راست تھے، سرسید احمد نے بعد میں مولانا نورالحسن کے ایک اور بیٹے مولانا محمد سلیمان کو بھی علی گڑھ بلایا تھا، ان کو کالج میں اچھی

ملازمت دی اور بڑی ذمہ داریاں سپرد کیں، پھر مولانا محمد اکبر کے داماد منشی محمد سعید فاروقی کا بھی کالج میں تقرر ہوا۔

اس سے پہلے کاندھلہ کے حافظ عبدالرزاق کو ابتدائی دینیات اور قرآن مجید کے حفظ کا استاد مقرر کیا تھا، اس خانوادہ کے ایک اور فرد عبدالرحمٰن حیرت جھنجھانوی تقریباً ۴۵ سال تک سفر و حضر میں سرسید احمد کے رفیق رہے، سرسید کے گھر میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کے ساتھ سرسید احمد کی یگانگت اور تعلق کا یہ حال تھا کہ جہاں سرسید احمد کا بستر بچھتا اس کے قریب ان کا بستر ہوتا، کھانے ناشتے ہر ایک میں شریک رہتے اور ہر وقت سائے کی طرح سرسید احمد کے ساتھ چلتے تھے، اس کی وجہ جو سرسید احمد خود بیان کیا کرتے تھے یہ تھی کہ استاد مرحوم نے ان کو میرے سپرد کیا تھا۔

اب کہاں اپنے استادوں کی ایسے قدر کرنے والے، ان کی بات کا ایسا پاس لحاظ رکھنے والے اور ان سے کیے ہوئے وعدوں کو اس طرح نبھانے والے ۔

''اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے''

مولانا کی سرسید پر مزید عنایات اور خط و کتابت کا اہتمام: جس طرح سرسید احمد مولانا سے ہر وقت رابطہ رکھتے اور اپنے ہر ایک کام اور انجمن میں مولانا سے مشورہ کرتے تھے، اسی طرح مولانا بھی سرسید احمد کو برابر یاد رکھتے اور خطوط سے نوازتے رہتے تھے۔ مولانا کے جو کاغذات اس وقت تک موجود ہیں ان میں سے ایک کاغذ پر ایسے خطوط کی روانگی کی تاریخیں لکھی ہیں جو مولانا نے سرسید احمد کو بجنور کی ملازمت کے وقت الور سے تحریر کیے تھے۔

سرسید احمد ربیع الثانی ۱۲۷۱ھ (جنوری ۱۸۵۵ء) میں دہلی کے صدر مقرر ہو کر بجنور گئے تھے۔ مولانا نے سرسید احمد کے بجنور کے قیام کے پہلے چھ مہینے جو خط لکھے ان میں سے صرف ان خطوط کا مولانا کی یادداشت میں اندراج ہے، جن کا محصول، خط روانہ کرتے وقت ادا کر دیا گیا تھا ''محصول دادہ شد'' جو خط بلا محصول ادا کیے یا بیرنگ بھیجے گئے وہ ان کے علاوہ تھے خطوط کی تحریر کی تاریخیں یہ ہیں:

۷؍رجب ۱۲۷۱ھ (۲۶؍مارچ ۱۸۵۵ء) ۸؍شعبان (۲۵؍اپریل)

۲؍رمضان (۱۹؍مئی) ۱۰؍ذی قعدہ (۲۵؍جولائی)

۱۳؍ذی الحجہ (۲۷؍اگست)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ استاد شاگرد میں کس قدر روابط تھے اور کس کثرت سے دونوں میں خطوط کا تبادلہ ہوتا تھا، مولانا نورالحسن کے نام مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین آزردہ کے جو مکتوبات محفوظ ہیں ان سے بھی اس کا علم ہوتا ہے کہ سرسید احمد کا مولانا نورالحسن سے رابطہ اور خط و کتابت دونوں صاحبان سے روابط و مراسلت کہیں زیادہ تھی، اسی کا اثر تھا کہ ہمارے خاندان میں ۱۹۷۰ء تک

سرسید احمد کے تقریباً سو خطوط محفوظ تھے جو مولانا نورالحسن کے علاوہ ان کے بیٹوں، مولانا ضیاء الحسن صادق (وفات ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۸ء) مولانا ظہورالحسن محمد ابراہیم، مولانا فیض الحسن محمد اکبر (وفات ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء) مولانا ریاض الحسن محمد سلیمان (وفات فروری ۱۹۰۸ء) اور عبدالرحمٰن حیرت جھنجھانوی کے نام تھے، اس وقت ان میں سے صرف چند خطوط موجود ہیں ان میں سے سب سے پہلا اور قدیم ترین دستیاب خط آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔

مولانا نورالحسن کے والد ماجد، مولانا ابوالحسن کاندھلوی بھی سرسید احمد پر مہربان تھے، سرسید احمد ان کی خدمت میں بھی عریضے بھیجتے تھے، اور مولانا ان کے جوابات لکھتے تھے۔ مولانا حسن کی یادداشتوں میں بھی سرسید احمد کے خطوط آنے اور مولانا کے جوابات کا تذکرہ ہے۔

سرسید احمد کے متعلق مولانا نورالحسن کی ایک پیشین گوئی جو پوری ہوئی: حضرت مولانا نورالحسن جو سرسید احمد کے فکر و مزاج سے بہت زیادہ واقف تھے بہت پہلے سے محسوس کر رہے تھے کہ سرسید احمد آنے والے دور کے قائد اور نہایت مشہور شخص ہوں گے، لیکن ان کی ذہانت اور عالی دماغی سے سخت خطرہ بھی ہے کہ وہ صحیح راستہ سے دور یا مشکوک نہ ہو جائیں۔ مولانا نے یہ بات دہلی کی ایک نشست میں ۵۱-۱۸۵۲ء کے قریب اس وقت کہی تھی جب سرسید احمد دہلی میں منصف تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا سرسید احمد کے ذہن اور افتادِ طبیعت سے کس قدر آشنا تھے اور ان کو جو خطرہ یا اندیشہ تھا وہ کس قدر صحیح ثابت ہوا۔ مولانا کے یہ الفاظ خواجہ حبیب حسن انصاری سہارنپوری نے نقل کیے ہیں (جو غالباً اس مجلس میں موجود تھے) مولانا نے فرمایا:

> ''خیالات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سید باوقار یکتائے روزگار مشہور دیار و امصار ہوگا، ہر چند اس وقت عہدہ منصفی پر مامور ہے۔ ہاں خدا کرے رجحان طبع سید موصوف بالقابہ کا جانب ہادی رہے، اور مسکرا کر یہ آیت پڑھی ''انک لاتھدی من احببت'' پس ما حصل پیشین گوئی مولانا صاحب، خالی از تردد نہ تھا'' [۲۳]

تبادلۂ کتب کا معمول: مولانا سے سرسید احمد کا علمی رابطہ زمانہ تعلیم سے وفات تک جاری رہا، یہ رابطہ یا استفادہ دو طرح سے تھا، خطوط کے ذریعہ مولانا کی معلومات اور مشورہ سے رہنمائی حاصل کرتے اور مولانا بے نظیر کتابوں سے مراجعت کرتے اور فائدہ اٹھاتے تھے، مولانا نورالحسن کی یادداشتوں میں ایسی کئی کتابوں کے نام لکھے ہیں جو سرسید احمد کے یہاں مطالعہ کے لیے گئی تھیں۔

۱۔ استیعاب (فی معرفت الاصحاب ابن عبدالبر)

۲۔ برہان (شرح مواہب الرحمٰن علامہ ابن الترکمانی حنفی)

۳۔ مقامات بدیعی (بدیع الدین ہمدانی)

۴۔ لغات القرآن

۵۔ شرح مقامات جلد اول

ان سب پر یہ مختصر اشارہ تحریر ہے: ''نزد سرسید احمد خاں صاحب''

سرسید احمد کا مولانا کی وفات کے بعد بھی مولانا کے کتب خانہ سے استفادہ کا سلسلہ قائم رہا، سرسید احمد اور جسٹس سید محمود مولانا کے کتب خانہ سے اپنی ضرورت کی کتابیں موقع بہ موقع منگواتے رہتے تھے، کچھ استفادہ کے بعد واپس آجاتیں کچھ رہ جاتیں۔ مولانا آزاد لائبریری میں ایسی کئی کتابیں موجود ہیں جو اس خاندان کے کتب خانہ کی ہیں، ان میں حضرت مفتی الٰہی بخش، مولانا نورالحسن کی تحریریں، مہریں ثبت ہیں، اور چند ایک پر سرسید احمد اور جسٹس سید محمود کے قلم سے بعض نوٹس اور تصریحات بھی ہیں، مثلاً ایک نسخہ جام جم کا ہے جو سرسید احمد کی ابتدائی تالیفات میں ہے، اس کا ایک نسخہ مصنف نے مولانا نورالحسن کی خدمت میں پیش کیا تھا، بعد میں خود سرسید احمد کے پاس بھی اس کا کوئی نسخہ نہیں رہا تو غالباً انہوں نے مولانا محمد اکبر سے اس کا تذکرہ کیا ہوگا، مولانا نے وہی نسخہ جو سرسید احمد نے مولانا نورالحسن کی نذر کیا تھا، سرسید احمد کو پیش کر دیا، اس نسخہ پر سرسید احمد کے قلم سے لکھا ہوا ہے:

''مولوی محمد اکبر بمن دادند''

ہمارے ذخیرہ میں ایسی متعدد کتابیں تھیں کہ ان پر سرسید احمد اور جسٹس سید محمود کی تحریریں اور نوٹس درج تھے، جسٹس سید محمود کے مطالعہ میں رہی فتاویٰ عالمگیری اور قانون کی بعض کتابیں اس وقت تک موجود ہیں جس میں سے قانون کی ایک کتاب سرخ لکیروں کے نشانات سے گویا ورق لالہ بنی ہوئی ہے۔

سرسید کے مولانا نورالحسن سے تلمذ کی متاخر تصدیقات:

مولانا نورالحسن سے سرسید احمد کے تلمذ کا علی گڑھ کالج کے استادوں میں اور کالج سے وابستہ اصحاب میں چرچا رہتا تھا، اس کا یہاں تک اہتمام تھا کہ اس خاندان کے طالب علموں کو کالج کے مختلف شعبوں یا ذمہ داروں کی طرف سے جو سرٹیفکٹ دیئے جاتے تھے ان میں یہ لکھا جاتا تھا کہ ان کا:

''مولانا نورالحسن سے رشتہ ہے جو سرسید احمد کے استاد تھے''

مثلاً مولانا نورالحسن کے پرپوتے اور ایم اے او کالج کے طالب علم، مولوی ظہیر الحسن کاندھلوی (ایم اے) کے لیے فلاسفی کے صدر اور پروفیسر ایم ایم شریف صاحب نے ۲۳ر اپریل ۱۹۲۲ء کو جو سرٹیفکٹ دیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:

"Mr Zahirul Hasan belongs to a Family of
Scholars of great Reputation. His great grand

father was a man of great learning had among his pupils man like Sir Syed Ahmad Khan. His grand father was the first senior professor of Arabic in the M.A.O College"[۲۴]

''جناب ظہیر الحسن کا تعلق ایسے خانوادہ سے ہے جس میں بلند مرتبہ دانشور اور علماء ہوئے ہیں، ان کے پردادا (مولانا نور الحسن) ایک عالی مرتبہ استاد تھے، ان کے شاگردوں میں اوروں کے علاوہ عالی مرتبت سرسید احمد بھی تھے۔ ان ظہیر الحسن کے دادا محترم (مولانا محمد اکبر) ایم۔اے۔او کالج کے شعبۂ عربی کے پہلے سینئر پروفیسر تھے''

میر ولایت حسین نے (جو ایم اے او کالج کی ممتاز تاریخی شخصیت، کالج کے ابتدائی دور کے طالب علم اور سرسید احمد کے عہد میں مختلف حیثیتوں سے کالج سے وابستہ رہے اور کالج کی چلتی پھرتی تاریخ تھے) کالج کے متعلق اپنی یادداشتوں (آپ بیتی) میں کالج کے سب سے پہلے استاد اور عربی کے پروفیسر مولانا محمد اکبر کاندھلوی کا ذکر کرتے ہوئے ان کو ''استادزادہ سرسید احمد'' لکھا ہے، پوری عبارت درج ذیل ہے:

''مولوی محمد اکبر صاحب سرسید احمد کے استادزادہ، پروفیسر عربی کی تنخواہ ستر روپے تھی اس کے علاوہ مولوی صاحب مینیجر بورڈنگ ہاؤس بھی تھے، اس کا الاؤنس تیس روپے ماہوار ملتا تھا''۔[۲۵]

کالج کے ابتدائی زمانہ کی اور بھی کئی یادداشتوں اور مضامین میں مولانا محمد اکبر کا بحیثیت استادزادہ سرسید احمد تذکرہ آیا ہے، ہمارے دور کے محققین میں سے ڈبلیو ٹرول نے بھی مولانا نور الحسن کو استاد سرسید احمد لکھا ہے، اور صراحت کی ہے کہ:

''آگرہ کی ممتاز مسلمان شخصیتوں میں مولوی محمد نور الحسن سرسید کے سب سے قریب معلوم ہوتے ہیں، سرسید احمد نے انہیں کی حوصلہ افزائی سے ابتدائی مذہبی کتابیں لکھیں، انہوں نے ان کتابوں کی تصحیح بھی کی تھی۔''[۲۶]

ٹرول نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ:

''سرسید احمد ان (مولوی نور الحسن) کے لئے استاذی اور ملاذی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، جس سے استاذ شاگرد کے قریبی تعلقات کا علم ہوتا ہے۔''

فتح پور کے آخری زمانۂ ملازمت میں مولانا نور الحسن کی سفارش سے سرسید احمد آگرہ کالج کے

نائب ممتحن مقرر کر لیے گئے تھے اور مولانا کی سرپرستی میں امتحانات میں شریک ہوا کرتے تھے۔

اور بھی متعدد شواہد سے سرسید احمد کے مولانا سے تلمذ، روابط اور نیازمندی کا علم ہوتا ہے۔ سرسید کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور معاملات پر بھی مولانا نورالحسن کی سیرت و کردار کے خاص اثرات محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

مگر تعجب بلکہ افسوس ہے کہ حالؔی نے سرسید احمد کی تصریحات سرسید کی محفلوں میں مولانا نورالحسن کا بار بار بلکہ کثرت سے تذکرہ سننے، مولانا محمد اکبر اور حکیم عبدالرحمٰن صاحب سے ذاتی واقفیت، کالج کے ابتدائی تمام مرحلوں اور متعدد شعبوں میں مولانا نورالحسن کے فرزندوں، رشتہ داروں کی تقرری اور کالج کی انتظامیہ میں ان کے اثرات کے متواتر مشاہدہ کے باوجود، مولانا نورالحسن کے احوال و تعارف کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا ہے۔ جان بوجھ کر اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ حالؔی نے سرسید احمد کی مؤلفات و تراجم جلاالقلوب، تحفہ حسن، معیار العقول یقیناً دیکھی پڑھی تھیں، ان سب کا حالی نے حیات جاوید میں ذکر کیا ہے، ان سب سے بڑھ کر آثار الصنادید ہے۔ کیا حالؔی نے اس کو بار بار پڑھا دیکھا نہ ہوگا، اور کیا اس میں سرسید کے قلم سے حضرت مولانا سے تلمذ کی صراحت حالی کی نظر سے نہ گزری ہوگی اور کیا حالی کو اس کا علم نہ ہوگا کہ آثار الصنادید میں مولانا کا تذکرہ کیوں آیا ہے۔ حالی کے سرسید احمد سے جو تعلقات اور ملاقات تھی کیا اس میں کبھی اس کا ذکر نہ آیا ہوگا، اور کیا حالی نے سرسید احمد کی مجلسوں میں مولانا محمد اکبر اور بعد میں ان کے بھائی محمد سلیمان اور حافظ عبدالرحمٰن جھنجھانوی کو ہر وقت موجود پا کر اس کا سوال نہ کیا ہوگا، اور کیا یہ بات ان کے مشاہدہ میں نہ آئی ہوگی کہ مولانا محمد اکبر سرسید احمد کے بنگلہ میں قیام پذیر تھے اور دوپہر کے کھانے میں سرسید احمد کے شریک رہتے تھے۔ کیا حالؔی نے اس خصوصیت اور ان سب کے روابط کی تفصیل سرسید احمد سے دریافت نہ کی ہوگی، اور خود ان صاحبان اور کالج کے بہت سے افراد کی زبانوں سے سرسید احمد کی خاص عنایت والطاف کا ذکر نہ سنا ہوگا، یہ سب ہوا ہوگا اور یقیناً ہوا ہوگا، مگر جب حالؔی اپنے خاص استاد اور مربی اور محسن مولانا نوازش علی صاحب کو نا قابل التفات اور نا قابل تذکرہ سمجھتے تھے [۲۸] تو وہ مولانا نورالحسن کے ذکر خیر اور ان کی اولاد کی کالج میں بلند منصبی اور اثرات کو کس طرح گوارہ اور پسند کر سکتے تھے۔ [۲۹]

یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ شاید اور متعدد لوگوں کی طرح حالی بھی سرسید احمد کے حضرت مولانا نورالحسن اور ان کے گھرانہ سے فرط تعلق اور ان کے کالج کے نظام میں با اثر اور دخیل ہونے سے کبیدہ خاطر تھے، اسی لیے سرسید احمد کی زندگی کے اس اہم عنوان کو مولانا سے سرسید احمد کے تلمذ کو، سرسید احمد کی زندگی اور کردار پر مولانا کے گہرے اثرات کو، ایک خاص ارادہ سے نظر انداز کیا ہے۔

سرسید احمد نے مولانا سے تلمذ کا اپنی کتابوں میں جو برملا اعتراف اور تذکرہ کیا ہے اور حالی نے

سرسید احمد کے مولانا سے آگرہ میں استفادہ کا جو ایک ناتمام اشارہ کیا ہے، یہ دونوں مل کر ایک خاصی مکمل تصویر بنا دیتے ہیں کہ سرسید احمد نے مولانا سے آگرہ کے قیام کے زمانہ میں عربی کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں اور مولانا کے حسن تربیت سے سرسید احمد نے تعلیم میں اس تیزی سے عمدہ ترقی کی کہ آگرہ کالج میں معاون ممتحن بنا دیئے گئے۔

سرسید احمد کی مولانا نورالحسن کاندھلوی سے تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی اطلاعات حیات سرسید احمد کا ایک اہم باب ہے، ضرورت ہے کہ سرسید احمد کے قدرداں اور سرسید شناس اصحاب اس موضوع پر توجہ دیں اور اس کے تمام پہلوؤں کو دریافت کر کے اس ناتمام باب کو تکمیل تک پہنچائیں۔

سرسید احمد کا مولانا نورالحسن کے نام قدیم ترین دستیاب مکتوب: مولانا نورالحسن، ان کے فرزندان اور بعض اعزہ کے نام سرسید احمد کے جو خطوط ہمارے ذخیرہ میں اس وقت تک موجود ہیں ان میں سرسید احمد کا مولانا کے نام پہلا دریافت خط یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ خط سرسید احمد نے ۱۸/اپریل ۱۸۴۹ء (۱۳/جمادی الاول ۱۲۶۵ھ) کو غالباً دہلی سے لکھا ہے، ہلکے آسمانی رنگ کے ۱۳/۱۲اس م پیمائش کے باریک کاغذ پر لکھا ہوا ہے، اب اس کاغذ کا رنگ خراب ہو کر ہلکا ہو گیا ہے، پہلے صفحہ کی پیشانی تقریباً آٹھ سینٹی میٹر سادہ جگہ چھوڑ کر خط کی ابتدا ہوئی ہے، دائیں جانب ڈھائی سینٹی میٹر بائیں جانب اس سے کچھ کم سادہ حاشیہ ہے، پہلے صفحہ پر کل نو سطریں دوسرے پر تیرہ سطریں تحریر ہیں۔

یہ خط سرسید احمد کے مکتوبات میں کئی وجوہ سے قابل توجہ ہے:

۱۔ یہ فارسی میں ہے اور سرسید احمد کی فارسی تحریریں خصوصاً فارسی خط کم دستیاب ہیں۔

۲۔ یہ پہلا دریافت خط ہے جو سرسید احمد نے اپنے کسی استاد کو لکھا ہے۔

۳۔ سرسید احمد کے قدیم ترین معلوم مکتوبات میں دوسرا خط ہے۔

شیخ اسماعیل پانی پتی نے مولوی سید بندہ علی کے نام سرسید احمد کے خط، مکتوبہ ۴/جون ۱۸۴۹ء کو سرسید احمد کا سب سے پرانا معلوم خط قرار دیا ہے،[۲۸] یہ خط اس کے ڈھائی مہینہ پہلے کا ہے، مگر اب یہ خط سرسید احمد کا قدیم ترین دریافت مکتوب نہیں ہے، اس سے پہلے کا سرسید احمد کا ایلیٹ کے نام لکھا ہوا خط دریافت ہو گیا ہے، مکتوبہ ستمبر ۱۸۴۷ء جواب تک معلوم مکتوبات میں قدیم ہے۔

اس خط سے سرسید احمد کے اس تعلق و محبت کا علم ہوتا ہے جو ان کو مولانا نورالحسن سے تھی۔ یہ خط آثار الصنادید کی تصنیف کے دو سال بعد لکھا ہے، اس میں بھی وہی جذبہ وہی نیاز مندی، ویسا ہی غیر معمولی تعلق و محبت اور وہی اطاعت و فرماں برداری کی صفت جھلک رہی ہے۔

اس خط میں سرسید احمد، حضرت مولانا سے ملاقات کے تصور میں مسرور و مخمور ہیں، ملاقات کی توقع اور اپنے یہاں مولانا کے آنے کی خبر پر ایسے خوش ہیں جیسے کوئی بڑی دولت ہاتھ آ گئی ہو، اور زندگی کا ایک بڑا مقصد

پورا ہوگیا ہو۔ لکھا ہے کہ قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر مجھے ہندوستان کی بادشاہت دے دی جائے تو مجھے ایسی خوشی نہ ہوگی جیسی خوشی آنجناب کے آنے کی خبر سے ہوئی ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ میں آنجناب کا خادم اور کم ترین غلام ہوں، مگر مجھ پر عنایت اور نوازش ہوگی تو یہ احسان نہیں بلکہ ذرہ نوازی، وہی کرم اور معاملہ ہوگا جو بڑوں کا اپنے چھوٹوں پر ہوتا ہے، اور بڑوں کی پرورش و بندہ پروری کی وہ روایت ہے جو قدیم سے چلی آرہی ہے۔

سرسید کے مکتوب کا فارسی متن

''جناب حضرت قبلۂ کونین وکعبۂ دارین مدظلہ العالی!

بعد سلام مسنون الاسلام، و بجا آوری آداب وتسلیمات! معروض آں کہ دوقطعہ عنایت نامہ شرف صدور فرمود، معزز وممتاز گردانید، عنایت نامہ ثانی کہ درآں ارادہ رونق افروزی ایں جا، در ایام حصول رخصت بود، گویا درحقیقت جان در جانب پیچاں دمید۔

خداداند کہ ہر قدر اشتیاق وتمنائے ملازمت جناب کہ باب خاکسار است، آں جناب راشمہ ازاں ہمہ معلوم باشدیا نباشد، لیکن چوں دل راایں صفت می دانم، بادرم است کہ جناب راہم چنیں مسرت وخوش خواہد بود۔

الحال کہ جناب ارادہ خود ظاہر فرمودند، ناحق منت بریں خاکسار نہادند، ورنہ ضرور ارادہ کردہ بودم کہ ہرگاہ جناب بحصول رخصت بدولت خانہ تشریف خواہند آورد، جناب را تکلیف قدم رنجگی ایں جا خواہم داد، واگرچہ توقع انکار از حضرت نہ داشتم، لیکن ارادہ کردہ بودم کہ شاید اگر انکار فرمودند جنگ خواہ ساخت، نعوذ باللہ! جنگ چہ معنی دارد، بمنت وعاجزی پیش خواہم آمد۔

الحال کہ حضرت خواد ارادۂ آں کردہ اند، بخدا سوگند است کہ ایں قدر خوشی حاصل شدہ است کہ اگر بادشاہت بمن میداند ایں قدر خورسندی نمی یافتم۔

لیکن چوں غم دشمن بہم اند، اندیشہ دارم کہ مبادا ایں وعدہ بوفا نہ انجا نجامد، محبت قلبی وارادہ دلی کہ بہ جناب دارم اگرچہ تقاضائے آں می کند کہ دعائے وفائے وغیرہ ہم نکنم، چہ رشک کے می گزارد کہ

دیگراں، ہم از فیض خدمت عالی فیضیاب شوند، لیکن بہر حال ہمہ راپسندیدم، ودعاہا می کنم کہ خداوند کریم، ایں وعدہ را بانجام مع الخیر باتمام اساناد، بالنبی والہ الامجاد!

بہرحال خادم کمترین غلام شما ام، اگر ذرہ نوازی و پروردۂ پروری خواہد ساخت بعید از عنایت بزرگانہ نخواہد بود، من جناب را کم تر از بزرگان و مربیان خود نمی دانم، پس ہر چہ خواہد ساخت احسان و منت نیست، چہ از بزرگاں نسبت حال خوداں ہمیں رسم است۔

باقی حالات ایں جابدستور است، امرے تازہ نیست کہ عرض نمایم خصوصاً دریں وقت کہ آتش شوق ملازمت سر بفلک کشیدہ است ہر چہ می آید ہمہ رامیسوزد، اگر چہ دوسہ امر نوشتنی بخدمت بودند لیکن ہمہ فراموش شدند، متعاقب ان شاء اللہ خواہم نگاشت۔

از ارادہ حصول رخصت مطلع فرمایند کہ تاکے صورت خواہد بست۔

والسلام

عرضی

خاکسار سید احمد

۸/اپریل ۱۸۴۹ء

(۱۳/جمادی الاول ۱۲۶۵ھ)

ترجمہ:

جناب حضرت قبلہ کونین و کعبہ دارین! اللہ تعالیٰ آنجناب کا مبارک سایہ دراز فرمائے۔سلام جو اسلام میں مسنون ہے اور آداب و تسلیمات بجالانے کے بعد، گذارش یہ ہے کہ دووالا نامے صادر ہوئے، معزز و ممتاز کیا، دوسرا گرامی نامہ جس میں چھٹی کے زمانہ میں یہاں تشریف لانے کے ارادہ کا ذکر تھا، اس نے جسم میں جیسے زندگی کی روح دوڑا دی۔

اللہ تعلیٰ جانتے ہیں کہ جناب والا سے ملاقات کا اور آں محترم کی خدمت میں حاضری کا، اس ناچیز کو اس قدر شوق ہے (جو بیان سے باہر ہے) جناب عالی کو شاید اس کا علم ہو یا نہ ہو۔لیکن چوں

کہ دل کے اس معاملہ کو میں جانتا ہوں، امید کامل ہے کہ آں جناب بھی ایسی ہی مسرت اور خوشی ہو رہی ہوگی۔

اس وقت آنجناب نے اپنا ارادہ ظاہر کیا ہے، بلاوجہ اس خاکسار پر احسان رکھا ہے، ورنہ میں نے خوب ارادہ کر رکھا تھا کہ جب جناب والا چھٹی کے موقع پر اپنے گھر تشریف لائیں گے، آنجناب کو یہاں آنے کی تکلیف دوں گا، اور اگرچہ حضرت مولانا سے انکار کی امید نہیں رکھتا لیکن ارادہ کیے ہوئے تھے کہ اگر بالفرض انکار کر دیں گے تو زبردست لڑائی کروں گا، اللہ کی پناہ! لڑائی کیا معنی، خوشامد اور عاجزی سے پیش آؤں گا، اس وقت کہ آں جناب نے خود اس کا ارادہ کرلیا ہے، اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے اس کی اس قدر خوشی ہوئی ہے کہ اگر ہندوستان کی بادشاہت بھی مجھے دے دیں، اس قدر خوشی محسوس نہ ہوگی۔

لیکن چوں کہ غم دشمن بھی موجود ہے ڈرتا ہوں کہ یہ وعدہ پورا نہ ہو، دلی محبت اور قلبی عقیدت جو جناب سے رکھتا ہوں، وہ اگرچہ اس کا تقاضہ کرتی ہے کہ میں وعدہ پورا نہ ہونے کی دعا کروں، کیونکہ یہ رشک ہوتا ہے کہ (یہاں تشریف لائیں گے تو) اور لوگ بھی جناب والا سے فیض یاب ہوں گے، لیکن بہرحال میں، سب کو پسند کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ کریم اس وعدہ کو خیر وعافیت سے پورا کرائے۔ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی محترم اولاد کے طفیل!

میں بہرحال آں جناب کا خادم اور کمترین غلام ہوں، اگر ذرہ نوازی اور پالے ہوؤں کی اور پرورش وسرپرستی ہو تو بزرگوں کی عنایت (طریقہ) کے خلاف نہ ہوگا۔

میں آں جناب کو اپنے بزرگوں اور مربیوں سے کم نہیں سمجھتا، اس لیے آں جناب جو کچھ بھی کریں گے وہ (مجھ پر) احسان وکرم نہیں، کیونکہ بڑوں کی طرف سے اپنے چھوٹوں کے لیے یہی دستور ہے۔

باقی یہاں کے حالات اسی طرح ہیں، کوئی تازہ بات نہیں ہے کہ

عرض کروں، خصوصاً اس وقت جب جناب سے ملاقات کا شوق بہت ہی زیادہ ہے، جو خیال یا معاملہ (سامنے) آتا ہے، آں جناب سے ملاقات کا شوق اس کو جلا کر خاک کر دیتا ہے۔
اگر چہ دو تین باتیں آنجناب کی خدمت میں عرض کرنے کے لائق تھیں، لیکن سب بھول گیا، ان شاء اللہ بعد میں لکھوں گا۔
چھٹی ملنے کے منصوبہ سے مطلع فرمائیں کہ کب تک اس کی صورت ہو سکے گی۔

والسلام
عرضی
خاکسار سید احمد
۸/اپریل ۱۸۴۹ء

یہ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ سر سید احمد کا پہلا دستیاب خط ہے، ایک اور خط جو ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے وہ بھی کئی پہلوؤں سے اہم اور لائق توجہ ہے، اس میں سر سید احمد نے اپنی کتاب ''تبیین الکلام فی تفسیر التورات والانجیل علی ملت الاسلام'' کے پہلے حصہ کی اشاعت پر مختلف حلقوں کی طرف سے جو ردعمل ہوا اور سر سید احمد کے متعلق جو خیالات سامنے آئے ان کا اس خط میں تذکرہ ہے اور سر سید احمد نے مولانا نور الحسن کو لکھا ہے کہ میں یہ کتاب آں جناب کی خدمت میں روانہ کر رہا ہوں، آپ پڑھ کر فرمایئے کہ میں در حقیقت کیا ہوں، مسلمان، عیسائی، یہودی یا کچھ اور!

یہ مفصل خط ۳۱/ستمبر ۱۸۶۲ء (۹/رجب ۱۲۷۹ھ) کو غازی پور سے لکھا تھا، یہ خط اور سر سید احمد کے مولانا کے فرزندوں، عزیزوں اور اپنے خاندان کے بعض بڑے لوگوں کے نام سر سید احمد کے چند اور مکتوبات آئندہ فرصت میں نذر قارئین ہوں گے۔

حاشیے

۱۔ مولانا ابوالحسن حسن کاندھلوی، خلف مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، (کاندھلہ، ضلع مظفر نگر، مغربی یو۔پی) تقریباً ۱۲۰۰ھ (۱۷۸۶ء) میں پیدا ہوئے، والد ماجد سے تعلیم حاصل کی، طب کے سبق لیے اور مثنوی مولانا روم پڑھی۔ تعلیم کے بعد میرٹھ میں منصرم بندوبست مقرر ہوئے، سلوک و معرفت میں والد سے بیعت اور ان ہی کے خلیفہ مجاز تھے۔
مولانا حسن خوش فکر اور قادر الکلام شاعر تھے، مولانا روم کی مثنوی کے پہلے دفتر کا مولانا مفتی الٰہی بخش نے اردو میں

منظوم ترجمہ شروع کیا تھا، جو ایک ہزار اشعار تک پہنچ کر رہ گیا تھا، مولانا حسن نے اس دفتر کو آخر تک مکمل کیا، منبع فیض العلوم کے نام سے یہ ترجمہ کئی مرتبہ شائع ہوا۔

مولانا کی طبع زاد مثنویوں میں مثنوی بحر الحقیقت اور گلزار ابراہیم اور سمجھ بوجھ اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا کرنے میں عجب تاثیر رکھتی ہیں اور ۱۲۵۰ھ (۳۵-۱۸۳۴ء) سے آج تک چھپ رہی ہے، جس میں خصوصاً گلزار ابراہیم مشہور و ممتاز ہے، ایک اور مثنوی خنجر عشق تھی جو ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء میں چھپی تھی۔

اردو فارسی کے کلام کے مجموعہ بھی مرتب کیے تھے جو اب مفقود ہیں، ان کے علاوہ حل الغوامض کے نام سے غرائض (میراث) میں اور طب میں بحران کے موضوع پر ایک رسالہ علمی یادگار ہیں۔

مولانا ابوالحسن خوبصورت، خوب سیرت، خوش اخلاق شخص تھے، بتلا میرٹھی نے جو مولانا کے قریبی دوست ہیں لکھا ہے: جوان خوبرو، خوش خو، و رنگیں طبع...... میر محمد خاں سرور، کریم الدین پانی پتی اور مصطفےٰ خاں شیفتہ نے بھی مولانا حسن کا ذکر کیا ہے۔ مولانا حسن کی ۱۳/ رجمادی الآخر ۱۲۶۹ھ/۲/ مارچ ۱۸۵۳ء کو کاندھلہ میں وفات ہوئی۔

مزید معلومات کے لیے مذکورہ تذکرہ کے علاوہ، نزہتہ الخواطر مولانا عبدالحیٔ حسنی جلد ہفتم۔ سفینۂ رحمانی حکیم عبدالرحمٰن حیرت جھنجھانوی نول کشور لکھنؤ ۱۸۸۳ء حالات مشائخ کاندھلہ اور راقم سطور کا مضمون مشمولہ ضمیمہ امداد المشتاق (سوانح) حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی) مرتبہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی: (دہلی: ۱۹۸۳ء)

۲۔ مولانا مفتی الٰہی بخش خلف مولانا حکیم شیخ الاسلام کاندھلوی، ۱۱۶۲ھ میں پیدا ہوئے، والد سے ابتدائی کتابیں پڑھ کر دہلی حضرت شاہ عبدالعزیز کے مدرسہ میں داخل ہوئے، اس وقت حضرت شاہ ولی اللہ کے آخری ایام تھے، اس لیے شاہ عبدالعزیز کے شاگردوں کی اس جماعت میں شامل ہوئے جس نے سب سے پہلے شاہ عبدالعزیز سے استفادہ کیا، شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے ساتھی اور ہم سبق تھے۔ تعلیم کے بعد نجیب الدولہ کی سرکار میں پھر ان کے بیٹے ضابطہ خاں کی ریاست میں مفتی اول کے عہدہ پر فائز رہے۔

جب ضابطہ خاں کے بعد غوث گڑھ تباہ ہوا تو وہاں سے آگئے اور ملک میں مختلف مقامات پر اور ریاستوں میں ملازم رہے۔ آخر میں وطن آگئے تھے، یہیں ۱۵/ جمادی الآخر ۱۲۴۵ھ (۲۱ دسمبر ۱۸۲۹ء) کو وفات ہوئی۔

جلیل القدر عالم، بڑے صاحب معرفت، بڑے طبیب، معلم، مدرس مصنف، مترجم، ادیب و شاعر اور گوناگوں کمالات کا مجموعہ تھے، بے شمار ممتاز شاگردوں کے علاوہ عربی، فارسی، اردو میں ایک سو سے زائد تصانیف و مؤلفات اور ترجمہ وغیرہ علمی یادگار ہیں۔

۳۔ مولانا ۱۸۳۰ء میں دہلی کالج میں پڑھتے تھے، اس سال نورالانوار کے امتحان میں جو انعام اور سرٹیفکٹ ملا تھا وہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

۴۔ مولانا نورالحسن نے شاہ محمد اسحاق سے دو مرتبہ حدیث شریف کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں۔

۵۔ یہ تمام معلومات مولانا نورالحسن کے قلم سے ان کی مختلف کتابوں پر درج ہیں۔

۶۔ ٹامس مٹکاف سے مولانا کے روابط اور کالج کی ملازمت کے لیے سفارش کا اس سپاس نامہ یا تحریر میں ذکر ہے جو ہندوستان کے گورنر جنرل کے مولانا کے مکان پر (کاندھلہ) آنے کے وقت لکھی گئی تھی۔

۷۔ سرسید احمد کے یہ الفاظ اس تحریر سے لیے گئے ہیں جو سرسید احمد نے مولوی علاء الحسن کاندھلوی کی ایم۔اے۔او کالج سے ڈپٹی کلکٹری کی سفارش کے لیے لکھوائی تھی، یہ تحریر خیال ہے کہ جسٹس سید محمود کے قلم سے ہے اور اس میں تصحیح و ترمیم سرسید احمد کے قلم سے۔ یہ قیمتی دستاویز ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

میر ولایت حسین، مولوی علاء الحسن کو یہ سرٹیفکٹ دیے جانے پر آزردہ خاطر تھے، وہ خود اس ملازمت کے متمنی تھے مگر سر سید کی سفارش کی ذمہ داری کی وجہ سے یہ جگہ مولوی علاء الحسن کو مل گئی۔ میر ولایت کی ناگواری کے احساس اور کلمات کے لیے دیکھیے ''آپ بیتی یا ایم۔اے۔او کالج کی کہانی میر ولایت حسین کی زبانی ص: ۱۰، ۱۱ (علی گڑھ: ۱۹۷۰ء)

۸۔ یہ تمام تاریخیں مولانا کے قلم سے مختلف یادداشتوں میں موجود و محفوظ ہیں۔

۹۔ مولانا نور الحسن کے نام مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا مفتی صدر الدین آزردہ وغیرہ کے مکتوبات مولانا کے چھوٹے بیٹے، مولانا ریاض الحسن محمد سلیمان کاندھلوی نے جمع کیے تھے، یہ قلمی مجموعہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے، اور اس میں سے مفتی صدر الدین آزردہ کے خطوط، میرے ترجمہ اور حواشی کے ساتھ مجلہ غالب نامہ دہلی میں شائع ہو چکے ہیں۔ شمارہ جنوری ۱۹۸۳ء اور جنوری ۱۹۸۵ء۔

۱۰۔ ایسی چند کتابیں جو ان مشاہیر نے اپنی تحریر کے ساتھ مولانا کی نذر کی ہیں، ہمارے ذخیرہ میں موجود ہیں۔

۱۱۔ مکتوب مولانا نور الحسن از الور۔ بنام مولانا نور الحسن کاندھلوی۔

۱۲۔ جس میں مولانا محمد بن غلام رسول سورتی کا واقعہ قابل ذکر ہے، وہ مقدمہ قاموس فیروز آبادی پڑھنے کے لیے ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے اساتذہ اور علمائے ادب عربی سے مایوس ہو کر کاندھلہ آگئے تھے مگر مولانا کی خدمت میں حیران ہو کر رہے، مولانا کے فرزند مولانا محمد سلیمان نے مولانا کے متعلق اپنی ایک مفصل یادداشت میں یہ واقعہ لکھا ہے۔

۱۳۔ یہ سب ہندوستان کی علمی تاریخ متعارف شخصیات ہیں، مختلف تذکروں خصوصاً نزہۃ الخواطر میں ان میں سے اکثر کے مختصر احوال درج ہیں، طوالت کے خوف سے حوالے نظر انداز کر دیے ہیں۔

۱۴۔ حیات جاوید، الطاف حسین حالی ص: ۴۴، ۴۵ جلد اول: (دہلی: ۱۹۳۹ء)

۱۵۔ حیات جاوید صفحہ: ۴۰۴ جلد دوم

۱۶۔ جلاء القلوب کی پہلی طباعت کے ایک سے زائد نسخے میری نظر سے گزرے ہیں۔

۱۷۔ جلاء القلوب سرسید احمد کے اپنے مرتب کیے ہوئے مجموعہ تصانیف احمدیہ میں شامل ہے، ملاحظہ ہو تصانیف احمدیہ ص ۱۸ جلد اول (انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ: ۱۳۱۳ھ) مولانا نور الحسن صاحب کے متعلق یہ حاشیہ اسی صفحہ ۱۸ پر درج ہے۔

نیز دیکھیے مقالات سرسید احمد مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی ص: ۵ تا ص: ۳۰ ج: ۷ (لاہور: ۱۹۶۵ء)

۱۸۔ تحفۂ حسن مشمولہ ''تصانیف احمدیہ'' ص:۲۴ تا ص:۲۷(علی گڑھ:۱۳۱۳ھ)
مقالات سرسید، شیخ اسماعیل پانی پتی ص:۸۵ تا ص:۸۷(لاہور)

۱۹۔ سرسید احمد خاں فکر اسلامی کی تعبیر نو......مصنف سی، ڈبلیو ٹرال: ترجمہ قاضی افضل حسین و محمد اکرام چغتائی صاحبان۔ص ۸۶(لاہور:۱۹۹۸ء)

۲۰۔ رسالہ جرثقیل بھی مقالات سرسید میں شامل ہے، ص:۲،۷۷ جلد:۱۶ لاہور

۲۱۔ (۲۰/ب) تصانیف احمدیہ کی کتابت ٹائپ پر ہوئی ہے اس کی وجہ سے کاندھلوی کے کاندھلی بن گیا ہے اور سنہ وفات میں بھی غلطی ہوگئی، مولانا نورالحسن کاندھلوی کی ۱۱/محرالحرام ۱۲۸۵ھ/۵مئی ۱۸۶۸ء) سہ شنبہ کو ہوئی تھی۔

۲۲۔ آثار الصنادید، باب چہارم..........ص:۱۲۶ (طبع (طبع اول دہلی، مطبع سید الاخبار ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء) اس نادر طباعت کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں ہے۔
آثار الصنادید، مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم ص:۱۱۴، جلد دوم (دہلی ۱۹۹۰ء)

۲۳۔ آزاد بیان، تبصرہ بر لکچر، سرسید احمد، بارہ دری لکھنؤ دسمبر ۱۸۸۷ء تالیف خواجہ حبیب حسین انصاری سہارنپوری ص:۳ (مطبع نسیم سحر، بدایوں:۱۸۸۸ء)

۲۴۔ یہ اصل سند یا سرٹیفکٹ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

۲۵۔ آپ بیتی میرولایت علی ص:۳۹ (علی گڑھ:۱۹۷۳ء)

۲۶۔ سرسید فکر اسلامی کی تعبیر نو ص:۷۷

۲۷۔ مولانا نوازش علی، حالی کے استاد اور مربی تھے، حالی ان کے مدرسہ میں رہے اور تعلیم حاصل کی، مگر حالی ان کا اس طرح تذکرہ کرتے ہیں جیسے کسی اجنبی کا تذکرہ کر رہے ہوں، حالی نے مولانا نوازش علی سے سرسید احمد کے تلمذ کی جو روایت اور ترتیب نقل کی ہے وہ مشتبہ معلوم ہوتی ہے، مولانا کے تعارف ، خدمات اور متعلقات کے لیے ملاحظہ ہو راقم سطور کا مضمون: ''دہلی کے ایک نامور عالم اور استاد اور تحریک ۱۸۵۷ء کے ایک مجاہد، مولانا نوازش علی دہلوی مہاجر مکی۔'' ماہ نامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، ص:۲۳،۴۰ (دسمبر ۲۰۰۴ء)

۲۸۔ مکتوبات سرسید مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی ص:۴ (مجلس ترقی ادب، لاہور:۱۹۵۹ء)

ب: مکتوبات سرسید طبع دوم دو جلدیں، ص:۱۵۰ جلد اول (لاہور:۱۹۷۶ء) بعد میں اس سے پہلے کا ایک خط، محررہ ۷/ستمبر ۱۸۴۷ء بنام ایلیٹ دریافت ہوگیا ہے۔ مضمون: ایلیٹ اور سرسید احمد خاں، ڈاکٹر معین الدین عقیل۔ مجلّہ تحقیق حیدرآباد سندھ ص:۳۶۹ شمارہ:۵ (۱۹۹۰ء)۔

☆☆☆



فکر و نظر

سہ ماہی

دسمبر ۲۰۰۷ء

جلد: ۴۴
شمارہ: ۴

مدیر

پروفیسر آزرمی دخت صفوی

۱۔ شبلی روڈ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ترتیب